ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

اسلامی ریاستی نظام: تجزیہ و تحلیل

"Islamic State System: Analysis and Evaluation"

☆ڈاکٹر سید محمد ہارون آغا
S.S.T(جنرل) محکمہ تعلیم حکومت بلوچستان کوئٹہ۔
☆☆محمد صدیق اللہ
وزٹنگ فیکلٹی، شعبہ اسلامیات، یونیورسٹی آف بلوچستان، کوئٹہ۔

Abstract
In this article, a research and critical review of the Islamic state system has been presented. Islam is a perfect religion and a complete system of life. While Islam emphasizes the reformation of the individual in individual life, it also lays down the golden principles of collective life and guides humanity in all areas of life. The system of politics and governance of Islam is different from the current democratic system. And it is completely free from its defects and corruption. In the Islamic system of life, where worship is important, affairs, society and ethics also have the first rank. Just as Islam has its own system of economy and its economic principles, in the same way Islam has its own system of politics and government. The requirements of both are fulfilled by each other, so Mawardi says that when the religion becomes weak, the government also becomes weak and when the government supporting the religion ends, the religion also becomes weak, its traces start to fade. Islam has never neglected the importance of the state in its entire history. Prophets (A.S.) struggled to subjugate the collective power of the time to Islam. The main idea of his call was that the authority should be pure only for Allah Almighty and Shirk should be eliminated in all its open and hidden forms. From the study of the Quran, it is known that Hazrat Yusuf, Hazrat Musa, Hazrat Dawud, and the Prophet ﷺ also established a regular Islamic state and ran it in a standard form. There is no concept of distance between religion and politics in Islamic thought and this is the reason why Muslims always struggled to establish their state on Islamic principles. This struggle is a requirement of their religion and faith. Just as there are teachings on morals and good character in the Holy Quran and Prophetic Hadiths, there are also clear orders about society, civilization and politics.

Keyword's: Islamic State System, Political Governance in Islam, Religion and Politics in Islam, Islamic Economic Principles, Collective Life in Islam

ابتدائی تعارف و تمہید:

اسلام ایک کامل دین اور مکمل دستورِ حیات ہے، اسلام جہاں انفرادی زندگی میں فرد کی اصلاح پر زور دیتا ہے وہیں اجتماعی زندگی کے زرین اُصول وضع کرتا ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں انسانیت کی راہ نمائی کرتا ہے اسلام کا نظامِ سیاست و حکمرانی موجودہ جمہوری نظام سے مختلف اور اس کے نقائص و مفاسد سے بالکلیہ پاک ہے۔ اسلامی نظامِ حیات میں جہاں عبادت کی اہمیت ہے وہیں معاملات و معاشرت اور اخلاقیات کو بھی اولین درجہ حاصل ہے۔ اسلام کا جس طرح اپنا نظامِ معیشت ہے اور اپنے اقتصادی اصول ہیں اسی طرح اسلام کا اپنا نظامِ سیاست و حکومت ہے اسلامی نظام میں ریاست اور دین مذہب اور سلطنت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے پورے ہوتے ہیں، چنانچہ ماوردی کہتے ہیں کہ جب دین کمزور پڑتا ہے تو حکومت بھی کمزور پڑ جاتی ہے اور جب دین کی پشت پناہ حکومت ختم ہوتی ہے تو دین بھی کمزور پڑ جاتا ہے، اس کے نشانات مٹنے لگتے ہیں۔

اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا۔ انبیاء کرام علیہم السلام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو جائے اور شرک اپنی ہر جلی اور خفی شکل میں ختم کر دیا جائے۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، اور نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم بھی کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا بھی۔ اسلامی فکر میں دین اور سیاست کی دوری کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا اور کا اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ اپنی ریاست کو اسلامی اصولوں پر قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ یہ جدوجہد ان کے دین و ایمان کا تقاضا

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

ہے۔ قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں جس طرح اخلاق اور حسنِ کردار کی تعلیمات موجود ہیں۔ اسی طرح معاشرت، تمدن اور سیاست کے بارے میں واضح احکامات بھی موجود ہیں۔

ریاست اور اسلام

اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا۔ انبیاء کرام علیہم السلام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار خدا اور صرف خدا کے لیے خالص ہو جائے اور شرک اپنی ہر جلی اور خفی شکل میں ختم کر دیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی پکار یہی تھی کہ:

۱۔یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ [1]

اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

اور ان میں سے ہر ایک نے خدا کے نمائندہ کی حیثیت سے اپنی قوم سے مطالبہ کیا کہ:

۲۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۔ [2]

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

خدا کے ان فرستادہ بندوں نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کے لیے جدوجہد کی، تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین قائم ہو، اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی یہ جدوجہد پوری زندگی کی اصلاح کے لیے تھی اور ریاست کی اصلاح ان ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ تھا۔ قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت دائود علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم بھی کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا بھی۔ بائبل اور تلمود کے مطالعے سے دوسرے انبیائے بنی اسرائیل کے بارے میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے کہ انھوں نے ریاست کے ادارے کی اصلاح کی کوشش کی اور غلط قیادت پر بھرپور تنقید کی۔

فکرِ اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ خالقِ ارض و سماوات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھاتا ہے کہ:

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا۔ [3]

اور دعا کرو: اے پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو داخل کر، سچائی کے ساتھ داخل فرما اور جہاں سے بھی نکال، سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنادے۔

یہ آیت ہجرت نبوی سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس تاریخی پس منظر سے اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے اور اس سے ریاست کے ادارے کی اہمیت بالکل روشن ہو جاتی ہے اور اس آیت کے مفہوم میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

---

[1] الاعراف:65۔

AlA'raf: 65.

[2] الشعرآء:163۔

AlShaar: 163.

[3] بنی اسرائیل:80۔

Bani Israel: 80.

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر، یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنادے، تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں، فواحش اور معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں اور تیرے قانونِ عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے، وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز، بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں، بلکہ خدا پرستی کا عین تقاضا ہے۔[1]

اس پر مزید روشنی مندرجہ ذیل آیات و احادیث سے پڑتی ہے:

۱۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۔[2]

ہم نے اپنے رسول کو واضح نشانیاں دے کر بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) اتاری ہے، تاکہ انسان انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے اتارا لوہا (ریاست کی قوت و جبروت) جس میں سخت قوت ہے اور لوگوں کے لیے بہت فوائد ہیں۔

۲۔ ہُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔[3]

وہی ہے (ذات باری تعالیٰ) جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے، خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔

۳۔ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔[4]

اور وہ جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «الإسلام والسلطان أخوان توأم، لا يصلح واحد منهما إلا بصاحبه، فالإسلام أس والسلطان حارس، وما لا أس له منهدم، وما لا حارس له ضائع»۔[5]

---

[1] تفہیم القرآن، ج۲، ص۶۳۸۔

Tafheem ul Qur'an, Vol. 2, p. 638.

[2] الحدید: 25۔

Hadid: 25.

[3] الصّف: 9۔

AlSaff: 9.

[4] المائدہ: 44۔

AlMaida: 44.

[5] أبو نعيم أحمد بن عبد الله بن أحمد بن إسحاق بن موسى بن مهران الأصبهاني (ت ٠هـ)، فضيلة العادلين من الولاة لأبي نعيم ، ص١٥٣، الناشر، دار الوطن ، الرياض، الطبعة: الأولى، هـ م

Abu Na'im Ahmad bin Abdullah bin Ahmad bin Ishaq bin Musa bin Mehran al Asbahani (d. 430 AH), Fazilah al Adalin min al Walaat by Abi Na'im, p. 153, Al Nasher, Dar Al Watan, Riyadh, Edition: Al Awlah, 1418 A.H. 1997 AD

اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان ہے، جس عمارت کی بنیاد نہ ہو، وہ گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو، وہ لوٹ لیا جاتا ہے۔

اسلامی فکر میں دین اور سیاست کی دُوئی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ اپنی ریاست کو اسلامی اصولوں پر قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ یہ جدوجہد ان کے دین و ایمان کا تقاضا ہے۔ وہ قرآنِ پاک اور احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جس طرح اخلاق اور حسن کردار کی تعلیمات پاتے ہیں، اسی طرح معاشرت، تمدن، معیشت اور سیاست کے بارے میں واضح احکام بھی پاتے ہیں۔ اس دوسرے حصے پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی ریاست ہو، اور اگر اس حصے پر عمل نہ کیا جائے تو شریعت کا ایک حصہ معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور قرآن کے تصور کا معاشرہ وجود میں نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے امت نے متفقہ طور پر نصب امامت کو فرض قرار دیا ہے اور اس بارے میں کوتاہی ایک دینی حکم کی بجا آوری میں کوتاہی ہے۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ عملاً صحابہ کرامؓ نے نصب امام کو کتنی اہمیت دی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جسد مطہر کی تجہیز و تدفین سے بھی پہلے امام کا انتخاب عمل میں آیا، جس نے آپؐ کے قائم کیے ہوئے نظام کو تھام لیا اور پھر پوری شانِ مرکزیت کے ساتھ سارے کام انجام دیے۔

اسلام مادی اقتدار چاہتا ہے اور اس کے بغیر وہ اپنا مشن پورا نہیں کر سکتا۔ یہ اقتدار بجائے خود مقصود نہیں ہے لیکن دعوت کی تکمیل اور اصلاحِ انسانیت کے عظیم کام کی انجام دہی کے لیے ناگزیر ذریعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے اس نکتے کو واضح کر دیا کہ اسلام کا مادی اقتدار اس کے روحانی اقتدار کا ذریعہ ہے اور اس کے نتیجے میں نیکیوں کا قیام اور برائیوں کا استیصال واقع ہوتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔[1]

یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انھیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ہماری اب تک کی بحث سے یہ نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ ریاست کا ادارہ انسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور مشکل ہے۔

۲۔ اسلام انسان کی پوری زندگی کے لیے ہدایت ہے اور اس نے اجتماعی زندگی کے لیے بھی واضح رہنمائی دی ہے۔

۳۔ اسلام دین و سیاست میں کسی تفریق کا روادار نہیں۔ وہ پوری زندگی کو خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے سیاست کو بھی اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے استعمال کرتا ہے۔

۴۔ یہ روش دنیا اور آخرت دونوں میں عتاب الٰہی کی موجب ہے کہ کچھ احکامِ الٰہی کو تو تسلیم کیا جائے اور کچھ دوسرے احکام سے صرفِ نظر اور روگردانی اختیار کی جائے، خواہ خواہش اور نفس کی اندرونی وحشت کی بنا پر، یا کسی بیرونی دباؤ یا مرعوبیت کی وجہ سے۔

۵۔ دین اور ریاست و حکومت کا اتنا قریبی تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ریاست و حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو ظلم اور بے انصافی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں چنگیزی، رونما ہوتی ہے اور اگر اسلام، ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کا ایک حصہ معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور خدا کا دین حکمرانی اور غلبے کے بجائے غلامی اور مغلوبیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ حکومت اسلام کی پابند ہو، اور اس کے قیام کے لیے سرگرم عمل رہے۔

---

[1] الحج:41۔

AlHajj: 41.

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

دور جدید اور اسلامی ریاست

یہ تو ہے مسئلے کا دینی پہلو، لیکن اگر ہم دور حاضر کے تجربات کی روشنی میں اس پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا قیام وقت کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے۔ مغرب میں لادینی ریاست کا تخیل ایک خاص پس منظر کی پیداوار ہے۔ وہاں پاپائی نظام نے جو شکل اختیار کر لی تھی اور مذہب کے نام پر بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کے ذریعے جن مظالم کو سند جواز دی گئی انھوں نے ایک رد عمل پیدا کیا۔ عیسائیت کی مخالفت میں اتنی بے اعتدالی پیدا ہوئی کہ خود مذہب ہی کے خلاف بغاوت کر دی گئی اور اس بغاوت کا سیاسی مظہر لادینی ریاست تھی۔

سیکولرزم کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا، جب جیکب ہولیک (۱۷۸۱ء۔ ۱۸۳۲ء) نے سیاست کو مذہب سے پاک رکھنے کی یہ تحریک قائم کی۔ اس تحریک کی سربراہی اہل فکر و سیاست کے ہاتھوں میں رہی اور بہت جلد اس مسلک کو سیاسی قبولیت حاصل ہو گئی۔ مختصراً اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مذہب کا دائرہ انفرادی زندگی تک محدود رہنا چاہیے اور اسے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ شروع میں بات صرف مذہب کے معاملے میں غیر جانب داری اور فرد کی کامل آزادی کی تھی، لیکن بعد میں اس تحریک کا ایک حصہ مذہب کی مخالفت اور جارحانہ مادیت اور اشتراکیت کا داعی بن گیا۔

مغرب میں لادینی ریاست کے جو اثرات رونما ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ سیکولرزم نے تشکیک اور ذہنی پراگندگی کو پیدا کیا ہے۔ کوئی ایک نصب العین انسان کے سامنے نہیں رہا اور ایک قسم کی بے عقیدگی پھیل گئی ہے۔ یہ اسی ذہنی انتشار اور فکری تَشَتُّت ہی کا نتیجہ ہے کہ اشتراکیت اور فسطائیت جیسی تحریکوں نے جنم لیا اور انسان کو مادہ پرستی کی انتہا کی طرف لے گئیں۔

اور جو حضرات اشتراکیت کی طرف نہیں گئے، وہ ذہنی بے اطمینانی، روحانی اضطراب، جذباتی تلوّن اور بے عقیدگی کا شکار ہوئے ہیں۔

۲۔ فرد کے سامنے نیا نصب العین صرف ذاتی اغراض و خواہشات کی تکمیل رہ گیا اور قومی پیمانے پر مصلحت اور موقع پرستی نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ظلم سے بھر دیا اور کوئی مستقل ضابطۂ اخلاق، ملکی اور قومی زندگی کے لیے باقی نہ رہا۔ نتیجتاً اس صدی نے دو ایسی ہولناک عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد انسانیت کی پوری تاریخ کی تمام جنگوں کے مجموعی مقتولین و مجروحین کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

۳۔ اس کے عام اخلاقی اثرات بھی تباہ کن تھے۔ مستقل مزاجی، پامردی، جرأت، اور سب سے بڑھ کر نیکی اور بدی میں تمیز کا مادہ ختم ہونے لگا اور افادیت، مصلحت بینی اور ابن الوقتی انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد بن گئے۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں سماجی اور معاشرتی برائیاں رونما ہوئیں جو معاشرے کو سکون و اطمینان سے محروم کیے ہوئے ہیں۔

۴۔ تجربے نے بتایا ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ پیشِ نظر ہو اور کوئی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نظام موجود نہ ہو، تو محض مادی فائدہ بھی انسان کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔

۵۔ پھر حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم عملاً ناکام ہی نہیں ہوا ہے، بلکہ تاریخ اب سیکولرزم سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو سیکولرزم آج ایک دقیانوسی اور ازکارِ رفتہ تصور ہے اور گردشِ ایام کے اس کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ سیکولرزم کچھ خاص تاریخی عوامل کی پیداوار تھا اور ایک مخصوص فضا ہی میں وہ کام کر سکتا ہے۔ اگر وہ عوامل موجود نہ ہوں تو اس کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔

سیکولرزم، جیسا کہ ہم نے اوپر کہا: اس نظام کو کہتے ہیں جس میں سیاسی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ لیکن اگر مزید تجزیہ کیا جائے تو بات یہاں آجاتی ہے کہ یہ مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری کا داعی ہے۔ انیسویں صدی کی سیاسی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرزم، انفرادیت، قومیت اور معاشی امور میں مکمل آزادی اور ریاست کی عدم مداخلت سیاست کے بنیادی تصورات تھے، اور یہ تمام تصورات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سیکولرزم اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ریاست صرف ایک دفاعی ادارہ (پولیس اسٹیٹ) ہو۔ یعنی اس کی ذمے داری محض نظم و نسق کو قائم رکھنا اور ملک کو بیرونی حملے اور اندرونی بدامنی سے بچانا ہو۔ ایسے ہی نظام ریاست میں فرد کو پوری آزادی دی جا سکتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گزارے اور صرف اسی صورت میں حکومت (کم از کم نظری حد تک) مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری کو روا رکھ سکتی ہے اور یہی تصور انیسویں صدی میں تھا لیکن آج ریاست کا تصور بدل گیا ہے۔ آج ریاست محض ایک عظیم الشان بت نہیں۔ آج یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک خاص دائرے کو چھوڑ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

کر ملک میں جو کچھ بھی ہو تا رہے، ریاست عدمِ مداخلت پر کار بند رہے گی۔ آج اس کے وظائف نہایت عظیم اور اس کا دائرۂ کار نہایت وسیع ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے کی صورت گری کرتی ہے اور اپنی پالیسی کے ذریعے سے اس کی ضابطہ بندی کرتی ہے۔ یہ حکومت کی ذمے داری ہے کہ وہ جہالت کو ختم کرے اور علم کی شمعیں روشن کرے، غربت کو ختم کرے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کی کوشش کرے، سماجی برائیوں کا قلع قمع کرے اور شہریوں کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم کا بندوبست کرے، بیماریوں کا علاج، مظلوموں کی فریاد رسی، مجبوروں کی مدد و استعانت کا اہتمام کرے۔ مختصراً، آج کی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے اور اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ نظریاتی غیر جانب داری برت سکے۔ اسے کچھ نہ کچھ اقدار کو تو ماننا ہو گا، کسی نہ کسی نظریے کو قبول کرنا ہو گا، خیر و شر اور فلاح و خسران کے کسی نہ کسی معیار کو اختیار کرنا ہو گا، اور اس کی روشنی میں اپنی پوری پالیسی کو ترتیب دینا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ریاست ایک نظریاتی ریاست بنتی جا رہی ہے اور وہ بنیادیں جن پر سیکولرزم کا نظامِ فکر قائم تھا، تاریخی یادوں کی حیثیت سے تو ضرور موجود ہیں لیکن دنیائے حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ جن بنیادوں پر یہ قلعہ تعمیر ہوا تھا وہ گر چکی ہیں اور محض تمنائوں کے ذریعے اس خلا کو پر نہیں کیا جا سکتا۔ آج کی دنیا میں سیکولرزم کے لیے کوئی گنجایش نہیں، تاریخ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ آج کی ضرورت نظریاتی ریاست ہے جو سیکولرزم کی عین ضد ہے اور جسے اسلام قائم کرنے کا داعی ہے۔

عالمِ اسلام میں اسلامی ریاست کی جدوجہد

اس پس منظر میں جب ہم قدرت کے اس انتظام پر غور کرتے ہیں کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد، مسلمان ممالک برسوں کی غلامی کے بعد پھر آزادی سے ہمکنار ہو رہے ہیں اور ان میں سے تقریباً ہر ملک میں اسلامی نظام اور اسلامی ریاست کے قیام کی تحریک زور پکڑ رہی ہے تو ہمیں فطرت کا یہ اشارہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ گویا جدید تہذیب کے زوال سے جو خلا رونما ہو رہا ہے، اُسے پُر کرنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انیسویں صدی میں مسلمان ممالک ایک ایک کر کے مغربی استعمار کے چنگل میں چلے گئے، اور صرف دو تین ہی ملک ایسے رہ گئے جو سیاسی غلامی کی تاریک رات سے محفوظ رہے۔ بیسویں صدی میں حالات نے کروٹ لی اور خصوصیت سے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مسلمان ممالک کی آزادی کا رجحان رونما ہوا۔ اس وقت ۳۴ آزاد مسلمان ملک موجود ہیں جو اپنے سیاسی اور تمدنی مستقبل کو خود تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مدینہ میں اسلامی ریاست کا نظام

اسلامی ریاست کے تین بنیادی اصول ہیں۔

۱۔ اقتدار اعلیٰ ۲۔ رئیس مملکت ۳۔ مجلس شوریٰ

اقتدار اعلیٰ

اقتدار اعلیٰ لاطینی لفظ (Suparanus) سے اخذ ہے اس کے معانی برتر و اعلیٰ (Supereme) کے ہیں۔

اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ کا منصب اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔ اسلامی نظریہ ریاست میں طاقت کا سرچشمہ اللہ رب العزت کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے الٰہی اقتدار اور حاکمیت کا نظریہ پیش کیا اور اسے اسلامی ریاست میں بتمام و کمال نافذ فرمایا ہے۔ اسلام کا موقف یہ ہے کہ ہر قسم کی حاکمیت کا مبدا اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اللہ تعالیٰ تمہارا رب ہے، اسی کی بادشاہت ہے، کوئی الٰہ اس کے سوا نہیں، پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو۔" (سورۃ الزمر۔ آیت 6)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

رئیس مملکت

ریاست نبویؐ میں اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کے دروبست مالک اللہ تعالیٰ ہیں۔ خلیفہ الارض حضرت آدمؑ کی وساطت سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی حاکم اعلیٰ کے نائب اور خلیفہ کی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوہ حسنہ شہادت فراہم کرتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جدوجہد کا محور یہ ہے کہ دنیا میں کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خود کو دوسرے انسانوں سے افضل سمجھے۔ اقتدار اعلیٰ صرف مالک اور خالق اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تمام تر کوششیں ریاست میں اللہ تعالیٰ کے قانون کی برتری کو قائم کرنے کیلئے وقف تھیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کے قانون کا نفاذ ہے۔

قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نوع انسانی کے لئے سرچشمہ ہدایت اور شارح کتاب اللہ ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مہبط وحی اور شارح کتاب ہونے کے باوجود قانون الٰہی کے قائم کردہ عمل سے اپنے آپ کو کبھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

"میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی ذات سے بھی قصاص لیتے تھے۔" (سنن ابن داؤد، جلد سوم، حدیث 1117)

یہ کسی معمولی کردار کا مظاہرہ نہیں تھا بلکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ اسلامی ریاست میں قانون الٰہی کی بالادستی و حکمرانی کو پوری قوت کے ساتھ نافذ فرمادیا اور اپنے وقت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جن مذہبی، سیاسی اور اجتماعی احکام پر عمل پیرا ہوئے وہ سب آنے والے زمانوں کے لئے نظیر بن گئے۔

قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں امت مسلمہ کے لئے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت ضروری اور واجب ہے۔ لیکن یہ عمل اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ اختلاف کی صورت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیصلہ مانا جائے گا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بحیثیت سربراہ اسلامی مملکت ریاست کی سب سے زیادہ ذمہ دار شخصیت تھے۔ تمام داخلی وخارجی معاملات کے نگران اور دینی ومذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ ساتھ دنیاوی اُمور کے بھی سربراہ تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام شارح قانون، سپہ سالار افواج اور قاضی القضات ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامیہ، مقنّنہ (قانون سازی) اور عدلیہ تمام شعبوں کے سربراہ تھے۔

شوریٰ

اسلام میں حاکم قرآن وسنت کا پابند ہوتا ہے، اسے ایمان والوں سے مشورہ کا پابند بھی کیا گیا ہے۔ سورۃ شُوریٰ میں ان مومنین وصادقین کی تعریف کی گئی ہے جن کے لئے آخرت کی کامیابی مقدر ہوچکی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں۔" (سورہ شوریٰ۔ آیت 37 تا 38)

یہ صادق الایمان اور اعلیٰ کردار سے آراستہ افراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کو دل وجان سے قبول کرتے ہیں اور اپنی ساری کوششوں کو اتباع میں لگا دیتے ہیں۔ یہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں یعنی ان کا تعلق اپنے خالق کے ساتھ ہوتا ہے، ان کی دوسری نمایاں ترین صفت یہ ہے کہ

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾۔[1]

[1] الشوریٰ: 38۔

AlShura: 38.

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

"ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ملکی، بنیادی مسائل اور اہم معاملات باہمی مشورے سے طے فرماتے تھے اور بعض اوقات گفتگو صرف مہاجرین و انصار تک محدود رہتی تھی۔ عام اور اہم معاملات میں بالعموم پہلی صورت اختیار کی جاتی تھی۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ استصواب رائے کی صورت میں حق رائے دہی کیلئے صرف دو شرائط ہیں۔ اسلام اور اسلامی شعور۔ اس صورت میں مرد عورتیں، بوڑھے، بچے، شہری دیہاتی اور مسافر سب رائے دینے کا حق رکھتے تھے۔

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں:

عن عائشة، قالت: "ما رأيت رجلا أكثر استشارة للرجال من رسول الله صلى الله عليه وسلم"۔[1]

"میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ مشورہ کرنے والا انسان نہیں دیکھا۔"

یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مبارکؐ میں شوریٰ کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اذان کے سلسلے میں شوریٰ کا اجتماع سن 1ھ میں ہوا۔

۲۔ غزوہ بدر کے موقع پر 2ھ میں معرکہ بدر سے متعلق شوریٰ کا انعقاد ہوا۔

۳۔ میدان بدر میں پڑاؤ کی جگہ کو بھی حضرت خبابؓ بن منذر کے مشورہ سے تبدیل کر دیا گیا۔

۴۔ شوریٰ برائے اسیران بدر 2ھ۔

۵۔ غزوہ احد سے پہلے 3ھ میں محاذ جنگ کے تعین کے لئے اجتماعی شوریٰ منعقد ہوا۔

۶۔ غزوہ خندق پر 5ھ میں جنگ کی تیاریوں کے سلسلے میں مشورہ۔

۷۔ صلح حدیبیہ سے پہلے دوران سفر 6ھ میں مشاورت کی گئی۔

۸۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے 10ھ میں حضرت معاذؓ بن جبل کو والی یمن مقرر کرنے کے لئے شوریٰ طلب فرمایا۔

گذشتہ ماہ امیر المومنین شیخ الحدیث مولانا ہبت اللہ اخندزادہ نے سپریم کورٹ سمیت تمام عدالتوں کو حکم دیا کہ جرائم ثابت ہونے اور حدود کے تمام شرائط پورے ہونے پر مجرموں پر حدود جاری کیے جائیں۔ حکم کی تعمیل میں صوبہ قندہار میں پانچ، بامیان میں دو، صوبہ تخار میں 19، صوبہ لغمان میں دو، صوبہ لوگر میں 14 اور کابل میں 21 مجرموں کو شرعی سزائیں سنائی گئیں۔ اس کے علاوہ بدھ کو صوبہ فراہ میں قتل کے بدلے ایک مجرم کو قصاص کیا گیا۔ امارت اسلامیہ کے دور حکومت میں یہ پہلا مجرم تھا جس پر قصاص کی سزا جاری کی گئی۔ جب یہ سزائیں دی جانے لگیں تو مغربی دنیا نے حسب معمول اس پر ایک طوفان کھڑا کیا۔ وہی رٹے رٹائے اعتراضات جو بر سہا برس سے شرعی سزاؤں کے نفاذ پر وارد ہوتے آئے ہیں۔ شرعی سزاؤں کو وحشیانہ اور خود ساختہ انسانی حقوق کے منافی قرار دیے۔ شرعی سزاؤں پر اعتراضات کا سلسلہ صرف افغانستان میں نہیں بلکہ دنیا کے کسی بھی اسلامی ملک میں اگر کبھی حدود کے نفاذ کا مطالبہ کیا گیا تو وہاں اسلامی حدود و تعزیرات کو غیر مؤثر بنانے کے لیے میڈیا کا سہارا لیا گیا اور ان پر وہی اعتراضات کیے گئے جو آج افغانستان میں کیے جا رہے ہیں۔

اصولی طور پر حدود کے حوالے سے تین باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

---

[1] البغوي، الحسين بن مسعود البغوي، شرح السنة صفحة 188، جزء 13، باب المشورة وأن المستشار مؤتمن، الناشر: المكتب الإسلامي، دمشق، بيروت۔
AlBaghwi, AlHusayn Ibn Mas'ud AlBaghwi, Sharh Sunnah page 188, Part 13, Chapter AlMushura and AlMushtar AlMu'taman, Publisher: Al Mahab AlIslami, Damascus, Beirut.

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

(۱) پہلی بات یہ کہ حدود کی تاکید کی وہی حیثیت ہے جو نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کی ہے۔ قرآن مجید میں مذکورہ احکام کا تذکرہ جن صیغوں کے ساتھ کیا گیا ہے حدود کا تذکرہ بھی انہی صیغوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ فرض ہے تو شرائط پورے ہونے پر زانی کو کوڑے مارنا اور شادی شدہ کو سنگ سار کرنا، چور کا ہاتھ کاٹنا اور قتل کے بدلے قصاص بھی فرض ہے۔ اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا قرآن کریم نے حدود سے تجاوز سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ قرآن کریم نے مجرموں کی جو سزائیں مقرر کی ہیں قیامت تک مجرموں کی وہی سزائیں اتنی ہی مقدار میں ہوں گی۔ کسی اتھارٹی کو کوئی اختیار نہیں کہ اس میں ردوبدل یا اس میں کمی بیشی کرے۔ چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے تو قیامت تک یہی سزا ہو گی۔ اس کے بدلے قید یا کوئی دوسری سزا نہیں دی جاسکتی۔ پاک دامن مرد یا عورت پر تہمت لگانے کی سزا 80 کوڑے مارنے ہیں تو اس سزا کی ماہیت اور نوعیت کو تبدیل کرنے کا اختیار کسی اتھارٹی کے پاس نہیں ہے۔

(۳) تیسری اصولی بات یہ کہ شرعی سزائیں اسلامی ریاست کی شرعی عدالتیں دے سکتی ہیں۔ کسی پرائیویٹ گروہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی طرف سے مجرم کو سزا دیں۔ کیوں کہ اس سے انارکی اور انتشار کی کیفیت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اور شریعت مطہرہ نے سزائیں ہی معاشرے سے ہر قسم کے فساد و انتشار کے سدباب کے لیے مقرر کی ہیں۔

شرعی سزاؤں پر اعتراضات کی فکری بنیاد:

مسلم دنیا میں شرعی سزاؤں پر اعتراضات کرنے اور اسے وحشیانہ و ظالمانہ قرار دینے کی باتیں ہر کچھ عرصہ بعد کی جاتی ہیں۔ ابھی کل ہی صوبہ فراہ میں ایک شخص کے قتل کے بدلے قصاص پر اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے مذمت کی۔ ان تنظیموں کا مطالبہ ہے کہ سزائے موت کے اسلامی طریقہ کار کو ختم کر کے پھانسی پر عمل درآمد کیا جائے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتراض اور غیر ضروری تشویش کی فکری بنیاد اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا دفعہ نمبر 5 ہے۔ اس دفعہ میں لکھا ہے کہ: "کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوز، یا ذلیل سلوک، یا سزا نہیں دی جائے گی۔

اب ان چند الفاظ میں اسلام کے پورے نظام فوج داری پر قدغن لگا کر اسے بہ یک جنبش قلم وحشیانہ، انسانیت سوز اور ذلیل کرنے والا قرار دے کر اسلامی سزاؤں کو ممنوع قرار دیے۔

اسلام کے فلسفہ جرم و سزا کا اگر گہرا مطالعہ کیا جائے اور جرم و سزا کے سلسلے میں اسلام کے مزاج کو جاننے کی کوشش کی جائے تو شاید کوئی سوال اور تشویش باقی نہ رہے۔ اسلام ہی نے ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل اور ایک انسان کی جان بچانے کو پوری انسانیت بچانے سے تعبیر کیا ہے۔ اسلام محض کسی معمولی جرم کے بدلے انسان کے قتل کا روادار نہیں ہے، بلکہ آخری حد تک انسانی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ صرف زنا کے ثبوت کے لیے رجم کی سزا جاری کرنے کی شرائط کا مطالعہ کافی ہے۔ رجم بلاشبہ ایک خوف ناک سزا ہے۔ مگر یہ تب جاری کی جائے گی جب دو شرائط پائی جائے۔ پہلی شرط مجرم کا اقرار جرم۔ دوسری شرط جرم کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی موجودگی۔ اقرار جرم سے پہلے قاضی مجرم کو روکے گا اور توبہ کرنے کی تلقین کرے گا۔ مگر پھر بھی اگر وہ اعتراف کرے تو چار ثقہ گواہ پیش کیے جائیں گے۔ اگر چار کی تعداد پوری نہ ہوئی تو مجرم کی بجائے الزام لگانے والے پر حد قذف یعنی (تہمت لگانے کی حد) جاری کی جائے گی۔ اگر کسی طرح چار ثقہ گواہ پیش کر دیے گئے تو پھر اسے سنگ سار کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجرم پیشہ ور ہے۔ انہوں نے لوگوں کی موجودگی کو بھی نظر انداز کر کے اس قبیح عمل کا ارتکاب کیا۔ اگر مجرم اس قدر پیشہ ور اور عادی ہے تو ایسے شخص کو سزا دینا صرف ان کے جرم کی سزا نہیں ہے بلکہ انہوں نے معاشرہ کو گدلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کوئی شخص سیہ کاری پر اس قدر جری ہے تو اسے واقعی ایسی سزا دینی چاہیے کہ جس سے رونگھٹے کھڑے ہو جائے۔

سنگ سار کرنے کی یہ سزا صرف اسلام ہی نے نہیں بلکہ سابقہ ادیان میں بھی سنگ سار کرنے کی سزا تھی، بلکہ سابقہ ادیان میں تو معمولی جرائم پر سنگ سار کرنے کی سزا کا تصور موجود ہے۔ جس کی تفصیل کے لیے مضمون کا دامن تنگ ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

افغانستان کے صوبہ فراہ میں ایک قتل کے بدلے قاتل کو قصاص کرنے پر اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی تنظیمیں چیں بہ جبیں ہیں۔ حالاں کہ قاتل کو اسی طریقے سے سزا دی گئی جس طریقے سے مغربی ممالک خصوصا امریکا اور برطانیہ میں دی جاتی ہے۔ امریکا اور برطانیہ میں زہریلی انجیکشن لگانے کے علاوہ مجرم کو گولی سے مار دیا جاتا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ فائرنگ سکواڈ مقرر ہوتے ہیں۔

اقوام متحدہ کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ مجرم کو سرعام کیوں سزا دی گئی؟ اس سلسلے میں معاشرے کی تطہیر کے لیے اسلام کے نظام فوجداری کا تقاضا ہے کہ اعتراف جرم کے بعد مجرم کو نشان عبرت بن جانا چاہیے۔ چناں چہ زنا کے سزا سے متعلق قرآن مجید کا فرمان ہے:

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ "

ترجمہ: اور انہیں سزا دینے کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود ہونا چاہیے۔

یعنی سزا سرعام ہو، لوگوں کی موجودگی میں ہو تا کہ وہ زنا کی سخت سزا دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔

شرعی سزاؤں کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہونے کے اسباب:

مغرب یا مغربی فکر و فلسفہ سے متاثرین کے اعتراضات کے مختلف اسباب ہیں۔ مجملہ ان میں سے ایک سبب دینی علوم، اسلام کے فوجداری قوانین اور اسلام کے عمومی مزاج سے ناواقفیت ہے۔ بس لوگوں نے سرسری طور پر یہ باتیں سن رکھی ہیں کہ چور کی سزا ہاتھ کاٹنا زانی کی سزا رجم اور پاک دامن مرد و عورت پر تہمت لگانے کی سزا 80 کوڑے لگانے ہیں۔ نہ ان سزاؤں کی حکمتوں کا علم ہوتا ہے اور نہ سزا کی سنگینی کا کچھ پتہ ہوتا ہے۔ دینی علوم سے ناواقفیت کی وجہ سے ایسے عامیانہ تبصرے صرف شرعی سزاؤں کے بارے میں نہیں کیے جاتے، بلکہ وہ تمام احکام جو عصر حاضر کے اباحیت پسند طبیعتوں پر گراں گزرتے ہیں تختہ مشق بناتے ہیں۔

شرعی سزاؤں پر اعتراضات کرنے کا دوسرا سبب مغرب سے مرعوبیت ہے۔ مغرب سے مرعوب ذہنیت کے لیے ہر وہ چیز قابل قبول ہے جو مغرب کے لیے قابل قبول ہو اور ہر وہ چیز قابل رد ہے جو مغرب کے لیے قابل رد ہو۔ اب مغربی ذہنیت کے ذریعے مغربی فکر و فلسفہ کو تو جانچا جاسکتا ہے مگر مغربی ذہنیت سے اسلامی احکامات کو پرکھا جائے گا تو اس کے نقصانات واضح ہیں۔

شرعی سزاؤں پر اعتراضات کرنے کا تیسرا سبب یہ ہے کہ اعتراض کرنے والوں کی نظر بس سزا ہی پر ٹکی رہتی ہے۔ جرم کی سنگینی اور اس کے نتیجے میں ہونے والے بہت بڑے نقصان کو یک سر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اگر جرم کی سنگینی بھی ملحوظ خاطر ہو اور اس سے معاشرے میں بگاڑ مد نظر ہو تو سزا عین حکمت ہے۔

اسلام نے جرائم اور سزاؤں میں حد درجہ توازن برقرار رکھا ہے۔ جرم جس درجے کا ہے سزا اسی درجے کی مقرر کی ہے۔ اگر جرم سنگین ہے اور سزا معمولی ہو تو اس سے معاشرے کی تطہیر کا مقصد پورا نہیں ہوگا اور اگر جرم معمولی ہے اور سزا زیادہ ہے تو یہ ظلم کے زمرے میں آتا ہے جو اسلام کے عادلانہ نظام کے خلاف ہے۔

عورت کی سربراہی

وہ واحد دستوری مسئلہ جس کی بابت اہل سنت کے تینوں مکاتبِ فکر (دیوبندی، اہلحدیث اور بریلوی) کے مفتیان کرام کے فتاویٰ کثرت سے دستیاب ہیں وہ مسئلہ عورت کی حکمرانی کا ہے۔ اس امر پر تینوں مکاتب فکر کے ہاں ایک طرح کا اجماع پایا جاتا ہے کہ عورت کی حکمرانی جائز نہیں اور اسلامی مملکت / حکومت کے سربراہ کا مرد از روئے شریعت مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔ اسلامی مملکت میں سربراہی کے منصب کی ذمہ داریاں کسی خاتون کو سونپی نہیں جاسکتیں۔ لہٰذا کسی اسلامی حکومت میں عورت کو سربراہ بنانا ہرگز جائز نہیں اور اگر کہیں ایسا ہو جائے تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جلد از جلد سربراہی کی تبدیلی کے لیے ممکنہ کوششوں کو بروئے کار لائیں۔[1]

[1] مولانا مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود (لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، جلد ۱۱، ص ۳۷۴۔۳۷۵۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

عورت کی حکمرانی کے عدم جواز میں مفتی محمد اشرف القادری نے بھی تفصیلی دلائل بیان کیے ہیں۔ ان کی رائے میں اسلام میں عورت سربراہ مملکت بوجوہ ذیل نہیں ہو سکتی:

ا: اسلام میں سربراہ مملکت کے تقرر سے دو باتیں مقصود ہوتی ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ اسلام میں سربراہ مملکت کی دو اہم ترین ذمہ داریاں ہوتی ہیں: اول اعلائے دین و تنفیذ و اشاعت شریعت؛ دوم سیاست مدن یعنی انتظام و دفاع مملکت و فلاح و نجاح رعیت۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کٹھن ذمہ داریاں، اعلیٰ ذہنی و جسمانی صلاحیتوں مثلاً جسمانی قوت و علمی وسعت، کمالِ عقل و بصیرت، حسنِ تدبیر و جودتِ عزم و حزم، معاملہ فہمی و اصابتِ رائے جذبات پر قابو اور خود اعتمادی، مصائب میں صبر و استقامت، شدائد میں جوانمردی و ثابت قدمی و استقلال اور کمال شجاعت کے بغیر قطعاً پوری نہیں کی جا سکتیں۔ اور یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان خداداد خوبیوں اور خلقی و قدرتی صلاحیتوں میں بلاشبہ مرد فطری طور پر عورت سے بڑھ کر اور اس کے مقابلے میں عورت ان صفات سے کمتر موصوف ہے۔ لہٰذا حکومت و سربراہی مملکت کا بار گراں عورت کے کمزور کاندھوں پہ ڈال دینا خلاف فطرت و ناانصافی ہے۔ ہاں اسلام کی نگاہ میں ان عظیم اور کٹھن ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا صرف اور صرف مرد ہی کا منصب ہے اور یہی فطرت و انصاف کا تقاضا ہے۔[1]

ان فتاویٰ میں قطعی اور واضح طور پر اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ عورت امامت کبریٰ یعنی امارت عامہ کی اہل نہیں۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ منصب قضا پر بھی فائزہ ہو سکتی ہے کہ نہیں؟ اس سلسلے میں مفتی محمود (۱۹۱۹۔۱۹۸۰ء) کی رائے یہ ہے کہ "ضروری طور پر بعض مسائل میں حدود و قصاص کے علاوہ اگر اس کو حکم (ثالث) بنایا جائے تو گنجائش ہے، اور اس میں بھی کامیابی مشکل ہے، لیکن کسی ملک کی تمام ذمہ داریوں کو اس کے حوالے کر دینا خلافِ عقل و نقل ہے"۔[2]

جیسا کہ سطورِ بالا میں مغربی جمہوریت اور اسلام کے سیاسی نظام کے مابین جوہری فرق کے بیان میں مفتی رشید احمد کی رائے نقل کی جا چکی ہے کہ اسلام کے نظام سیاست میں سربراہ مملکت / حکومت کے انتخاب و تقرر کے ضمن میں مملکت کے تمام شہریوں کو حق رائے دہی حاصل نہیں ہے بلکہ یہ حق صرف اور صرف اہل حل و عقد کو حاصل ہے۔ مفتی رشید احمد کی اس رائے کی تائید حافظ عبداللہ روپڑی کے فتویٰ سے بھی ہوتی ہے۔ حافظ عبداللہ روپڑی کی رائے میں بھی رائے عامہ کو اسلام کے سیاسی نظام میں کوئی اہمیت حاصل نہیں، بلکہ اصل اہمیت اہل حل و عقد کی رائے کو ہے۔ چنانچہ اسلامی مملکت / حکومت کے سربراہ کا انتخاب و تقرر رائے عامہ سے نہیں بلکہ اہل حل و عقد کی رائے کے ذریعے ہو گا:

"انتخاب مجلس شوریٰ کے ارکان حل و عقد کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علی کو جب باغیوں نے امیر بنانا چاہا تو فرمایا یہ تمہارا کام نہیں بلکہ مہاجرین و انصار کا کام ہے، جس کو وہ امیر بنائیں گئے وہ امیر ہو گا۔ مجموعی ووٹنگ اور رائے عامہ کوئی چیز نہیں۔ موقعہ محل کے لحاظ سے جس طرح انتخاب ہو جائے کر لینا چاہیے۔ جیسے ابو بکر صدیق کا انتخاب ہوا"۔[3]

Maulana Mufti Mahmood, Fatawa Mufti Mahmood (Lahore: Jamaat Publications, 2008), Volume 11, pp. 374375.

مفتی محمد رفیع عثمانی و مولانا سلیم اللہ، "عورت کی حکمرانی: اکابر علماء کا فیصلہ"، مشمولہ مفتی رشید احمد، احسن الفتاویٰ، جلد ۶، ص ۱۸۲۔

Mufti Muhammad Rafi Usmani and Maulana Salimullah, "Woman's Rule: Decision of Ekaber Ulama", Mufti Rashid Ahmad, Ahsan al Fatawa, Volume 6, p. 182.

احسن الفتاویٰ، جلد ۶، ص ۱۴۹۔۱۸۲؛ "عورت کی ولایت بالاجماع جائز نہیں"، احسن الفتاویٰ، جلد ۶، ص ۱۸۳۔۱۹۲۔

Ahsan Al Fatawa, Volume 6, pp. 149182; "Woman's guardianship is not permissible by consensus", Ahsan al Fatawi, Volume 6, pp. 183192.

[1] مفتی محمد اشرف القادری، امارۃ المرأۃ: عورت کی حکمرانی کے مسئلہ پر محققانہ شرعی فتویٰ (نیک آباد، گجرات: اہلسنت اکیڈمی، جون ۱۹۸۸ء)، ص ۳۔۵۔ عورت کی حکمرانی کے بارے میں جدید الخیال اہل قلم کے نقطۂ نظر کے بارے میں ملاحظہ ہو: مشیر الحق، "عورت کی حکمرانی: ایک اسلامی نقطۂ نظر"، صحیفہ (لاہور)، شمارہ اپریل، جون ۱۹۸۹ء، ص ۱۔۱۲۔

Mufti Muhammad Ashraf al Qadri, The Emirate of Women: Scholarly Shari'i Fatwas on the Issue of Women's Rule (Nikabad, Gujarat: Ahlesnat Academy, June 1988), pp. 5.3.

[2] مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود، جلد ۱۱، ص ۴۷۵۔

Mufti Mahmood, Fatawa Mufti Mahmood, Vol. 11, p. 475.

[3] حافظ عبداللہ روپڑی، فتاویٰ اہل حدیث (تحقیق و تدوین: محمد صدیق بن عبدالعزیز) (سرگودھا: ادارۂ احیاء السنۃ النبویۃ، س۔ن)، جلد ۳، ص ۴۰۲۔۴۰۳۔ حافظ عبداللہ روپڑی نے اپنی ایک دوسری کتاب مرزائیت اور اسلام میں بھی اس موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔

Hafiz Abdullah Ropari, Fatawa Ahl Hadith (Research and Editing: Muhammad Siddiq bin Abdul Aziz) (Sargodha: Ihya Sunnah Al Nabawa Institute, S.N), Volume 3, pp. 402403. Hafiz Abdullah Ropri has also expressed his views on this topic in detail in his other book Mirzaiyat and Islam.

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

مفتی رشید احمد کی رائے میں "عوام پر یہ فرض ہے کہ انتخاب امیر کا مسئلہ خود طے کرنے کی بجائے ایسے اہل حل وعقد کے سپرد کریں جن میں انتخاب کی اہلیت ہو۔ نصوص شرعیہ کے علاوہ عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ انتخاب امیر ہر کس وناکس کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور علم دین وتقویٰ کے بغیر عقل کامل نہیں ہو سکتی"۔[1]

سربراہ مملکت / حکومت کے انتخاب کے طریق کے بارے میں مفتیان کرام نے بالعموم قرونِ وسطیٰ کے سیاسی مفکرین کی آراء کو من وعن قبول کر لیا ہے۔ اور اس کا مطلق خیال نہیں رکھا کہ دور جدید کے ایک غیر قبائلی معاشرے میں جدید ریاستی نظاموں کے تجربات سے اخذ واستفادہ کرتے ہوئے انتخاب سربراہِ مملکت کے کون کون سے جائز طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ مفتی رشید احمد کی رائے میں اسلام میں انتخاب امیر کے تین طریقے ہیں:

ا: بیعت اہل وعقد، کما وقع لسیدنا ابی بکر۔

۲: استخلاف، خلیفۂ وقت چند اہل حل وعقد سے مشورہ کر کے کسی کے بارے میں وصیت کر دے کہ میرے بعد یہ خلیفہ ہو گا، جیسا کہ حضرت ابو بکر نے حضرت عثمان، عبد الرحمن بن عوف، سعید بن زید، اسید بن حضیر اور مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کو منتخب فرمایا۔[2]

استخلاف ابو بکر کی تفصیل مذکور سے ثابت ہوا کہ بذریعۂ استخلاف انعقاد خلافت کے لیے تین شرائط ہیں:

(ا) خلیفۂ اول میں خلافت کی سب شرائط موجود ہوں؛ (ب) خلیفہ ثانی بھی سب شروط خلافت کا مستجمع ہو؛ (ج) خلیفہ اول نے خلیفہ ثانی کے انتخاب میں اہل حل وعقد سے مشورہ کیا ہو۔

۳: شوریٰ، خلیفۂ وقت چند اہل حل وعقد کی شوریٰ متعین کر کے یہ وصیت کر دے کہ میرے بعد یہ لوگ اتفاق رائے سے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کریں، جیسا کہ حضرت عمر نے چھ رکنی مجلس متعین فرمائی، اس کے ذریعے حضرت عثمان کا انتخاب عمل میں آیا۔[3]

مفتی رشید احمد کی رائے میں اگرچہ خلافت راشدہ کے سیاسی نظائر سے انتخاب امیر کے یہی تین طریقے ثابت ہیں، البتہ انعقادِ خلافت کا ایک جو تھا طریقہ استیلاء وتغلب کا بھی ہے، یعنی خلیفہ وقت کی موت کے بعد کوئی شخص جبراً وقہراً مسلط ہو جائے۔ مفتی رشید احمد کے نزدیک ایسے شخص کی خلافت منعقد ہو جائے گی، اس لیے اس کی اطاعت واجب ہے۔ مفتی رشید کے نزدیک استیلاء وتغلب کے ذریعے انعقادِ خلافت کی بھی دو قسمیں ہیں:

ا) یہ شخص شروط خلافت کا مستجمع ہو اور لوگوں کو صلح وحسن تدبیر سے مائل کرے، کوئی ناجائز اقدام نہ کرے۔ یہ قسم جائز ہے، حضرت معاویہ کی خلافت اسی طرح منعقد ہوئی تھی۔

۲) اس شخص میں شروط خلافت نہ ہوں، اور اپنے مخالفین کو قتال اور دوسرے ناجائز حربوں سے تابع کر لے، یہ جائز نہیں، ایسا شخص فاسق اور سخت گنہگار ہے، مگر اس کے باوجود اس کے تسلط کے بعد اس کی اطاعت واجب ہے، بشرطیکہ اس کا حکم خلافِ شرع نہ ہو، اس کی مخالفت اور اسے معزول کرنے کی کوشش جائز نہیں۔[4]

---

[1] مفتی رشید احمد، احسن الفتاویٰ، جلد ۶، ص ۱۴۴۔

Mufti Rashid Ahmad, Ahsan al Fatawa, Volume 6, p. 144.

[2] ایضاً، جلد ۶، ص ۱۴۵۔

Also, Vol. 6, p. 145.

[3] ایضاً، ص ۱۴۵۔۱۴۶۔

Also, pp. 145146.

[4] ایضاً، جلد ۶، ص ۱۴۵۔۱۴۷۔

Also, Volume 6, pp. 145147.

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.7 No.4 2023

مفتی رشید احمد کے اس فتوے کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انعقادِ خلافت (خلیفہ کے انتخاب و تقرر) میں متقدمین مسلم سیاسی مفکرین میں سے الماوردی اور متاخرین میں سے شاہ ولی اللہ دہلوی کے نقطۂ نظر کو پورے طور سے اختیار کر لیا ہے۔[1]

خلاصہ بحث

اس مقالے میں اسلامی ریاستی نظام کا تحقیقاتی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اسلام مکمل دین اور زندگی کا مکمل نظام ہے۔ جبکہ اسلام فرد کی بدلتی پر زور دیتا ہے، وہی اسلام جماعتی زندگی کے سونے اصولوں کو بھی قائم کرتا ہے اور انسانیت کو زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلامی نظام حکومت اور حکومتی نظام موجودہ جمہوری نظام سے مختلف ہے اور یہ اس کی ایک بھی عیب و خرابی سے مکمل طور پر پاک ہے۔ اسلامی زندگی کے نظام میں عبادت کے علاوہ، معاملات، معاشرت اور اخلاق بھی اہم ہیں۔ جیسا کہ اسلام کا خود معاشرتی اور معاشی اصولات کا نظام ہے، اسی طرح اسلام کا اپنا سیاستی اور حکومتی نظام بھی ہے۔ دونوں کے اقتضاءات ایک دوسرے کو پوری کرتی ہیں، لہذا ماوردی کہتا ہے کہ جب دین ضعیف ہوتا ہے، تو حکومت بھی ضعیف ہو جاتی ہے اور جب حکومت دین کو حمایت کرنا ختم ہوتا ہے، تو دین بھی ضعیف ہوتا ہے اور اس کے نشانات دکھائی دینا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے اپنے تمام تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا۔ پیغمبروں (علیہم السلام) نے عصر کی جماعتی طاقت کو اسلام پر مختار کرنے کے لئے جہاد کیا۔ ان کے دعوت کا اصل اہم مقصد یہ تھا کہ حکومت صرف اللہ تعالی کے لئے پاک ہو اور ہر طرح کے شرک کو ظاہر اور پوشیدہ شکلوں میں ختم ہو۔

[1] انتخاب امام کے طریق کار کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے آراء کے بارے میں ملاحظہ ہو: ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (مترجمہ: مولانا عبد الشکور فاروقی و مولانا اشتیاق احمد) (کراچی: قدیمی کتب خانہ، س۔ن۔)، جلد ۱، ص ۱۷۔۲۶، ۳۳۔۳۵، ۵۳۱۔۵۳۶۔ خلیفہ کے انتخاب و تقرر کے طریق کار خصوصاً امارۃ الاستیلاء کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے خیالات و آراء کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو: عبید اللہ فہد، "شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار"، مشمولہ محمد یٰسین مظہر صدیقی (مرتب)، حجۃ اللہ البالغہ: ایک تجزیاتی مطالعہ (علی گڑھ: شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء)، ص ۲۱۹۔۲۲۸۔

Regarding Shah Wali Allah's views on the method of selection of Imams, see: Azalat al Khifah an Khilafah al Khilafah (Translated by: Maulana Abdul Shakoor Farooqi and Maulana Ishtiaq Ahmad) (Karachi: Puridim Katabkhana, S.N.), Vol. 1 , pp. 1726, 3335, 531536. For an overview of Shah Waliullah's views and opinions on the methods of choosing and appointing the caliph, especially the Emirate of Al Istila, see: Ubaidullah Fahd, "Political Thoughts of Shah Waliullah", edited by Muhammad Yasin Mazhar Siddiqui (edited), Hajjatullah al Balaga: An Analytical Study (Aligarh: Shah Waliullah Research Cell, Muslim University, Aligarh, 2002), pp. 228219.